تصوف: تلاشِ احسن کی ہمہ گیر تحریک

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی ☆

Abstract:

Tasawwuf is the supreme standard of one's spiritual state of Muslim. It represents the very pinnacle of faith. Where Ihsaan is the prestigious branch of faith and a vital component of Tasawwuf. Ihsaan means doing everything in an excellent manner and doing the acts of charity and kindness. The Holy Prophet (ﷺ) says about the Ihsaan: "it is to worship Allah as you are seeing Him while you see Him not yet truly He sees you. In relations to relatives, recognize their rights, be good and help them if they need help. In relations to people in society, whom are weak, needy and poor, be kind and nice to them, even those with whom you disagree in common matters, oblige to them and have no aggression towards them. In relations to the whole world including vegetables, animals and even inanimate things, do not waste, do not misuse, and be thankful to Allah.

Key Words:

Supreme Standard, Spiritual, Pinnacle, Faith, Vital, Component, Charity, Kindness, Society.

☆ صدر مرکز تحقیق فیصل آباد

اسلام ایک معاشرتی دین ہے اس لیے اسلامی تعلیمات اپنی روحانی نسبت کے باوجود معاشرتی تعلق کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ معاشرہ ایک ایسا مظہر ہے جس کی تعمیر وتدوین میں انسانی کاوشوں کی کارفرمائی ہے۔ ان کاوشوں کی تہذیب اسلام کا مقصود ہے کہ انسان ہی اسلامی تعلیمات کا مرکزی موضوع ہے۔ انسان دو جہتوں کا حامل وجود ہے، ظاہری یا مادی حیثیت اور باطنی یا روحانی جہت، ان دونوں جہتوں کے توازن اور ان میں مناسب باہمی ربط ہی میں انسانی زندگی کا حسن ہے۔ انسان کا ظاہر حواس سے عبارت ہے کہ حواس کی قوت، عقل وشعور کی راہنمائی میں انسانی زندگی کو فعال اور متحرک رکھتی ہے، یہ انسانی وجود کا خارج ہے، انسان کا باطن، عقیدے اور نظریے کی قوتوں کا امین ہے، اس کی پنہائیاں لامتناہی اور اس کی جولاں گاہ غیر محدود ہے۔ انسان کی ضرورت ہے کہ اس کا ظاہر یعنی مادی وجود بھی متحرک رہے اور اُس کا باطن بھی زندہ اور فعال ہو تا کہ وجود بہر پہلو مہذب اور مرتب رہے۔ دنیا کی نظریاتی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ انسان ظاہر و باطن میں عدم توازن کی وجہ سے دو مختلف جہتوں کا نقیب اور متضاد و معاند گروہوں میں تقسیم رہا ہے، مادہ پرست اور ماورائیت پسند، مادی تصورِ حیات انسان کو ذہنی حوالہ عطا کرتا ہے۔ اس لیے اُس کے تمام رویے اسی تصورِ حیات کی مناسبت سے ترتیب پاتے ہیں، یہ زمینی یا مادی حوالہ کبھی جنس کے روپ میں، کبھی مکانیت کے تصور میں اور کبھی زمانیت کی تنگ ناؤں میں نمودار ہوتا ہے جس سے نسلی، گروہی، ملکی، جغرافیائی حد بندیاں پیدا ہوتی ہیں اور قدیم وجدید کی مصنوعی تقسیم جنم لیتی ہے۔ اس کے برعکس ماورائی اندازِ فکر سے بے عملی، وجود سے نفرت اور معاشرتی فرائض سے فرار کے داعیات کو تقویت ملتی ہے اس طرح انسان، انسانوں سے بے زار، ملک وقوم سے متنفر اور آباد و شاداب دنیا سے کنارہ کش ہونے میں نجات محسوس کرتا ہے۔ اسلام دینِ کامل ہے، اس میں مادی خوشحالی اور روحانی عظمت کو مناسب مقام حاصل ہے، حسناتِ دنیا اور حسناتِ آخرت کی خواہش اس طرح ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی ہے کہ پوری اور مکمل انسانی زندگی اس کے دائرۂ اثر میں آگئی ہے۔ اسلامی تعلیمات، مادہ اور روح کو محیط ہیں۔ ان کا مطلب ایک ایسا انسان ہے جو مادی طور پر قوی پستی ظاہری طور پر پیکرِ جمال اور روحانی حیثیت میں بالیدگیوں کا مظہر اور شرفِ انسانیت کا حامل ہو، یہ بھی یاد رہے کہ اسلامی تعلیمات کے حوالے سے روح مرکزِ حیات ہے اس لیے اُس کے تقاضے مقدم ہیں۔ جسم روح کے تابع ہے اس لیے اس کے تقاضے مؤخر ہیں۔ اسلام کا اِصرار ہے کہ مادی ضابطے، روحانی اصولوں کے مطیع رہیں روح صدر نشین رہے اور مادہ حاضر باش حاشیہ بردار، صوفیہ کرام کی اصطلاح میں روح سوار ہے اور جسم سواری کی دیکھ بھال اور نگہداشت ضروری ہے مگر عظمت و رفعت سوار ہی کو حاصل ہے حفظِ مراتب کی

پاسداری ہی سے انسان کی عظمت وشرافت کو محفوظ کیا جاسکتا ہے اور اسلام کا مقصود ایسا ہی انسان ہے۔

ظاہری حرکات اور مادی افعال کو جب فکر کی راستی نصیب ہو جائے تو اعمال میں حسن اُترنے لگتا ہے اسلام، فکر کی اس راستی کو عقیدے کی پختگی کا عکس قرار دیتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہی احسان ہے اور اس تلاشِ احسن کی جدوجہد ہی اسلام کا مقصود ہے۔ حدیثِ جبرئیل جسے صحیحین نے روایت کیا واضح کر دیا گیا کہ عبادات جو عبدیت کے اظہار کا وسیلہ ہیں، کا حسن بھی یہی ہے کہ عمل کو باطن کے ایقان کی پناہ نصیب ہو، پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ جواب میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ''(۱) کہ اللہ تعالیٰ کی یوں عبادت کرے کہ جیسے تو اُس کو دیکھتا ہے اور اگر تو نہ دیکھ پائے تو یوں کہ جیسے وہ تجھے دیکھ رہا ہے'' حُسنِ عبادت یہ ہے کہ عبد اپنے معبود کے حضور حاضر ہو تاکہ حضوری کا گداز حاصل کرے اور اگر یہ مقامِ بلند حاصل نہیں۔ نظر اتنی بالغ نہیں کہ روایت کی منزل پالے تو اس یقین کے ساتھ عبادت ہو کہ وہ تو دیکھتا ہے۔ کوئی فعل جب اُس ذات کے حضور ادا ہو جس کے حکم کی تعمیل میں انجام پا رہا ہے تو وہ عملی وصف ظاہری حرکات کا مجموعہ نہیں رہتا، باطن کا عکس جمیل بھی ہوتا ہے اور اگر یہ یقین ہو جائے کہ دیکھنے والی ذات ظاہر سے کہیں بڑھ کر باطن کی لرزشوں کا بھی مشاہدہ کر رہی ہے تو عمل، خلوصِ نیت کا مظہر اتم بن جاتا ہے۔ پھر اعمال کا ہیولہ مختلف بھی ہو، حرکات وسکنات متفاوت بھی ہوں، تلاشِ احسن، کا عمل ہمہ وقت جاری رہتا ہے۔ اسلام اس کو احسان کہتا ہے اور ہر فعل وعمل کو اس کے تابع رکھنے کا حکم دیتا ہے۔ اس لیے کہ اسلام دینِ احسان ہے، مقصود ہر بہتر کی تلاش ہے، عبادات میں بھی، معاملات میں بھی، فرد میں بھی اور اجتماع میں بھی حتیٰ کہ اُن اعمال ومعاملات میں بھی جہاں بظاہر اس کا وجود ناممکن نظر آئے، قتل ایک بھیانک فعل ہے اس سے اجتناب کا حکم دیا گیا مگر جب برتر مقاصد کے حصول کے لیے یہ ناپسندیدہ عمل ناگزیر ہو جائے کہ کسی ناسور کا کاٹنا لازم ٹھہرے تو اس میں بھی احسن کی تلاش جاری رہی، جانوں کا ذبح کرنا ضرورتِ حیات کا لازمی نتیجہ ہے اس ضرورت کو بھی ''حُسنِ عمل'' سے مربوط کیا گیا۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْإِحْسَانَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ، اِذَا قَتَلْتُمْ فَاَحْسِنُوا الْقِتْلَةَ، وَإِذَا ذَبَحْتُمْ فَاَحْسِنُوا الذِّبْحَةَ وَلْيُحِدَّ اَحَدُكُمْ شَفْرَتَهٗ وَلْيُرِحْ ذَبِيْحَتَهٗ۔''(۲)

بے شک اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں احسان کا حکم دیا ہے، جب تم کسی کو قتل کرو تو احسن طریق سے اور جب تم کوئی جانور ذبح کرو تو عمدہ تر انداز سے، تمہیں چاہیے کہ دھار کو تیز کر لو اور جانور

کو آرام پہنچاؤ۔

غور فرمایئے کہ اگر صرف ذبح کرنا ہی مطلوب ہے تو وہ کند چھری سے بھی ہوسکتا ہے مگر اس میں شقاوت کا عنصر ہوگا۔ ایسے اگر کسی عضو کا کاٹنا ناگریز ہو جائے تو سر جن کند آلے سے بھی ایسا کر سکتا ہے مگر اس طرح کٹنے کے قابل عضو بھی کئی گنا زیادہ تکلیف کا باعث بنے گا۔ اعمال کا حسن یہ ہے کہ ادائیگی کا حق ادا ہو، حدیث مبارک میں مثلہ یعنی انتظام کی خاطر اعضاء بدن منع کیا گیا جہاں تک فرمایا گیا کہ ''لَوْ کَانَ بِالْکَلْبِ الْعَقُو'' اگر چہ ایسا عمل کاٹنے والے باولے کتے کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، معلوم ہوا اسلام اعمال کے بجا آوری میں شائستگی، متانت اور رحم دلی کی کارفرمائی کا خواہاں ہے، حسنِ عمل کی معراج ذاتِ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ میں ہے کہ آپؐ کی ذات میں ظاہر و باطن کی تمام رعنائیاں موجود ہیں، آپ کا ہر عمل مجسم حسن ہے اور آپ کا ہر رویہ، تلاشِ حسن کے راہ نوردوں کے لیے راہنما ہے اب حسنِ عبادت ہو یا حسنِ نظر، اس کی بھیک اُس حسنِ تمام کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے اور آپ کے ارشادات کی روشنی ہی میں تلاشِ احسن کی راہ آسان ہوتی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس حسنِ عمل کے ابتدائی حوالے ہیں کہ ظاہر و باطن کی حسنات کے امین ہیں اسی لیے اُنہیں آسمانِ ہدایت کے ستارے کہا گیا، حسنِ عمل کا یہ سفر اسلامی تعلیمات کے سایوں میں جاری رہا۔ صوفیہ کرام اس راہِ کے مسافر اور اسی اِحسان کے طلب گار ہیں کہ وہ شاہراہ حیات ہر حسن نیت اور حسنِ عمل کے نشان ہیں، ان بابرکت افراد کے ہاں علم، عمل میں دُھلا اور عمل اِحسان کے جذبوں کا امین بنا۔

انسانی فطرت میں جذب و انجذاب کے داعیات بڑے شدید ہیں، مادی احتیاج کا جبر آ جائے تو روحانی منزلت نظر انداز ہو جاتی ہے اور ماورائیت پسندی کا انہماک بڑھے تو معاشرتی ضابطے فراموش ہو جاتے ہیں یہ وارفتگی اور ہمہ تن گرویدگی کا شاخسانہ ہے کہ حد اعتدال سے انحراف ہونے لگتا ہے۔ کبھی امید خود سر بنا دیتی ہے تو کبھی خوف بے دست و پا کر دیتا ہے اس لیے متنبہ کر دیا گیا کہ نجات کا راستہ سلامتی کا سفر اور کامیابی کی منزل، خوف و رجاء کے درمیان ہے اسی لیے قرآنِ مجید نے اپنے اسلوبِ تلقین کو رجاء اور خوف کے دونوں رخوں سے آراستہ کیا۔ عذاب کا ہولناک نقشہ کھینچا تو متصلاً انعام و اکرام کی نوازشات کا بھی بیان ہوا تا کہ خوف فرار کی راہ نہ دکھائے اور رجاء بے عملی کی ترغیب نہ دے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۃ اسی توازن کا آئینہ دار ہے۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض نے دنیا سے لاتعلقی کی خواہش کا اظہار کیا تو تنبیہ فرما دی، حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ نے عرض کیا ''یا رسول اللہ میرا دل کہتا ہے میں دنیا چھوڑ دوں، پہاڑوں میں جا کر رہبانیت اختیار کر لوں، زمین میں گھوموں اور مال و دولت سے دست بردار ہو جاؤں، بیوی کو طلاق دے دوں،

گوشت نہ کھاؤں اور خوشبو نہ لگاؤں۔'' ترکِ دنیا کی اس خواہش کا سن کر نبی رحمت ﷺ نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا اور معاشرتی روابط کو برقرار رکھنے کی تلقین فرمائی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عنصرِ خیر میں اُسوہ رسول ﷺ کا یہ توازن غالب رہا مگر جب ملکی حالات عدم توازن کا شکار ہوئے تو بعض متوازن ذہن بھی بے رغبتی محسوس کرنے لگے۔ دین و دنیا کا بعد گھمبیر ہوتا گیا تو وہ اکابر جو اصلاحِ خلق کے مشن پر مامور تھے، مادی افراتفری سے ہٹ کر اصلاحی مراکز قائم کرنے لگے تاکہ عملی جدوجہد سے فرار کی حوصلہ افزائی نہ ہو اور دین متین کے معاشرتی تقاضے نظر انداز ہو جائیں۔ اس طرح زاویوں، خانقاہوں اور غرلت خانوں کی دنیا آباد ہوئی عقل کی تہذیب علماء کے ہاتھوں ہوئی تو دل کی تنویر صوفیہ کے سوزِ دل سے ان روحانی مراکز کا ہی نتیجہ تھا کہ سیاسی حالات کی ابتری کے باوجود روح کے تربیت کدے آباد رہے۔ یہ طریقِ اصلاح تصوف کہلایا اور اس راہِ عمل کے شناور صوفی کے لقب سے معروف ہوئے، یہ کوئی اجنبی تحریک نہ تھی اور نہ ہی فراریت کی دعوت تھی بلکہ یہ ہمہ جہت اصلاح، ہمہ پہلو عمل اور سراسر اسلامی تعلیمات کی حامل جدوجہد تھی کہ قوم میں قوتِ عمل کی افزائش ہو اور نظریاتی استحکام کی ترسیخ ہو۔

تصوف داخل کی اصلاح، باطن کی تہذیب اور خارج مظاہر کی تربیت کا ایک وقیع ادارہ ہے، اس سے معاشرتی حسن اور سماجی جمال کی ترویج ہوتی ہے، دل، زبان اور عمل کو یک رنگی نصیب ہوتی ہے، باطن کی نورانیت اعمال میں ڈھل کر تابانیوں کے فروغ کا ذریعہ بنتی ہے یہ ہمہ گیر تحریک، مقاصد کے حوالے سے باہمی تعاون اور ملی یک نیت کی نوید تھی یہی وجہ تھی کہ صوفیہ کے مختلف گروہوں میں مجادلت کی فضا پیدا نہ ہوئی، باہمی اکرام کی حفاظت کی گئی اور مناظرانہ چپقلش کی کوئی ضرورت پیدا نہ ہوئی، حسنِ تمام سے رشتہ مضبوط رہا اس لیے نظروں کے تفاوت کے باوجود نظری انتشار پیدا نہ ہوا۔ تصوف کے جملہ مدارج، اصلاح و فلاح کے نقیب رہے، محبت کی افزونی، اعتماد کی بالیدگی اور دعوتِ رائے کی پاکیزگی قائم رہی! ہاں یہ ضرور ہوا کہ بعض کوتاہ بین اس حسن کی رفوت کا ادراک نہ کر سکے۔ اُن کے اندر نورِ یقین کی لَو فروزاں نہ ہوئی مگر انہوں نے دنیاوی فعارات، ذاتی اغراض اور گروہی تعصّبات کے زیرِ اثر صوفیہ کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کی مگر یہ تمام تر کوشش لا حاصل رہی کہ کبھی بہروپ، روپ کا تقدس حاصل نہ کر سکا اس ممکنہ خطرہ کے پیشِ نظر صوفیہ متعلقین کو متنبہ کرتے رہے حتیٰ کہ مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ کو کہنا پڑا:

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نہ باید داد دست

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اس آمیزش کو محسوس کیا تو واضح کر دیا کہ تصوف کے حوالے سے انسانوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ صوفی: یہ وہ شخص ہے جو آپ سے فانی اور حق کے ساتھ ہو، اپنی طبیعت کے قبضے سے رہائی پائے ہوئے ہو اور حق کے ساتھ ملا ہوا ہو۔

۲۔ متصوف: وہ متکلف صوفی جو مجاہدے اور تکلف سے صوفیاء کی صف میں شامل ہو۔

۳۔ مستصوف: وہ انسان جو دنیاوی مال ومتاع اور عزت کو حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو صوفی ظاہر کرے، صفا اور تصوف سے اُس کا کوئی تعلق نہ ہو، یہ وہ جبلی صوفی ہے جو صوفیہ کے نزدیک حقیر مکھی کی طرح ہے جو آلودگی پسند ہے مگر یہی شخص غیر لوگوں کے سامنے بھیڑیا ہے کہ اُن سے مال ہتھیا لیتا ہے۔

ان ارشادات سے ظاہر ہے کہ صوفی تو صفائے قلب کا حامل وہ وجود ہے جس سے ہر لمحہ خیر کی توقع ہوتی ہے۔ وہ ذاتی اغراض سے محفوظ، بے لوثی کے حصار میں ہوتا ہے۔ مادی احتیاج کی آلودگی سے مستثنیٰ ہے کہ ہمہ وقت حاضری دربارِ الٰہی کی کیفیت میں رہتا ہے۔

صوفیہ کی زندگیوں پر نظر ڈالی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اُن کا دل غیر کے خیال سے پاک، غیر کی خوشنودی سے معوّن اور خالق کی رضا سے مملوء ہوتا ہے، اُن کو خیالات کی یکسانی اور جذبات کی یکسوئی حاصل ہوتی ہے کائنات کی بوقلمونی میں بھی وحدت کی طلب اُن کا مشن ہے اور بقول حضرت شمس تبریزی:

دوئی از خود بدر کردم یکے دیدم دو عالم
یکے دیدم یکے بینم یکے خواہم یکے دانم

اور وہ یک کون ہے، پکار اٹھتے ہیں:

ھو الاوّل ھو الآخر ھوالظاھر ھوالباطن
بخبر یا ھُو ، ھو ھو دگر چہرے نمی دانم

یہ وحدتِ آشنائی اُن کا رویہ بن جاتا ہے۔ مخلوق کی کثرت میں وہ خالق کی یکتائی تلاش کر لیتے ہیں اس لیے کہ اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَاحِدٌ ہر ایمان نظریاتی مشق ہی نہیں زندگی کی واردات ہوتا ہے، اِلٰہ واحدٌ سے کی منزل کا شعور ملتا ہے اور یہ شعور وحدتِ نسل انسانی ہر یقین کا باعث بنتا ہے، ایک باپ کی اولاد ہونے کے ناطے قرب زمینی حاصل ہوتا ہے اور ایک خالق ورب کے یقین سے انسانیت پر اعتماد قائم ہوتا ہے۔ یہ قرب اور یہ

اعتماد و معاشرت میں حسنِ خلق، حسنِ عمل اور حسنِ روابط کا محرک ہوتا ہے۔ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکیے تو ایسے مردانِ باصفا اور صوفیہ بے ریا کے کئی قافلے نظر آتے ہیں ان قافلوں میں ایک ایسا قافلہ سالار بھی ہے جو علم کا منبع، حلم کا مخزن، مجاہدے کا امام اور اشاعتِ دین کا روشن حوالہ ہے۔ ایک ہزار سال قبل کی سیاسی معاشرے اور سماجی حالات نگاہ میں رکھیے، برصغیر کی توہم پرستی، صنم آشنائی اور سماجی تفریق کو بھی پیشِ نظر رکھیے، کیا کسی مذہب کو اس ماورائیت پسند سرزمین پر قدم جمانے کا موقع ملا، ہندو کی ملفوف چرب زبانی اور بے حد و حساب خود نگری کسی کے لیے کوئی موافق فضا پیدا کرنے کے لیے معاون بنی، ایسی اجنبی فضا اور ایسے ماند ماحول میں تلاشِ احسن کا ایک خوگر حسنِ معاشرت اور حسنِ عمل کی اصلاح لیے میدانِ عمل میں آیا تو کیا ہوا؟ دشمنی کا توڑ دوستی کے فروغ سے توہم پرستی کا دفاع یقین کی سپہر سے تقسیمِ غلِ آدم کے زہر کا وحدتِ انسانیت کے تریاق سے ہوا، تاریکیاں کافور ہوئیں نظریات کی دھند سمٹنے لگی، رویوں کی تلخی معاشرت کی شیرینی سے پسپا ہوئی، نہ مال کا سہارا، نہ خاندانی وجاہت کا تعاون، نہ وعدوں کی جلترنگ اور نہ آسائشوں کی چکا چوند، ایک قوت، ایک ہتھیار اور ایک ہی ضرب کاری، حسنِ وقت کی نشاندہی، حسنِ عمل کی ترویج اور حسنِ معاشرت کا پرچار، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کی صداقت سب پر آشکار ہوئی کہ "اَلنَّاسُ اَبْنَاءُ مَایُحْسِنُوْنَ" لوگ اعمالِ حسن کے حامل افراد کے غلام ہوتے ہیں قرآنِ مجید کے اس ارشاد کہ "اِدْفَعْ بالتی ھِیَ أَحْسَنُ"(۳) دفاع کرو تو احسن طریق سے اور اگر معاملہ بگڑ جائے اور مخاصمانہ فضا قائم ہو جائے تو ایسے میں بھی "وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ أَحْسَن"(۴) اور جدال کرو مگر احسن انداز سے۔ معاملات کتنے بھی الجھے ہوئے ہوں اور بظاہر حسن و خوبی کا وجود ناممکن دکھائی بھی دے پھر بھی احسن کی تلاشی جاری رہے اور بہر حال رُخِ احسان کی جانب رہے، اِحسان زندگی کا ایک گوشہ نہیں مجموعی حوالہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اس پر گواہ ہے کہ آپ ہم تن احسان احسن تقویم انسان کے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں، حضرت داتا گنج بخش علی الہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے اس اسوہ کو اپنے وجود کا حصہ بنایا۔ احسان کی راہیں آسان بنانے کی تگ و دو کرتے رہے اس کا اثر یہ ہوا کہ مادیت میں لتھڑا ہوا انسان، معاندین کے صفوعین کا سالار اور آنے والے مجسم احسان سے پرخاش رکھنے والا وجود بھی حسنِ خلق کا گھائل ہوا اور شیخ ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کو دید پسندی کی شکل میں اپنے حسنِ عمل شہادت کے لیے ایک نایاب گواہ حاصل ہوا۔

آج بھی ضرورت اسی حسنِ عمل کی ہے۔ ہم خیر، ہم جہت اصلاح، سب کے لیے دردمند دل اور سب کے دکھوں کا مداوا کرنے والا نرم درکار ہے۔ دہشت و وحشت کے سیاہ پردوں میں راہِ حیات کے بھٹکتے مسافروں کے لیے حسنِ نظر اور حسنِ عمل کی ضیا درکار ہے۔ آیئے حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کے وقد انوار پر

احسن کی تلاش کا عہد کریں۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

ooo

حوالہ جات

۱۔ صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ، رقم الحدیث: ۵۰

۲۔ صحیح مسلم، کتاب الصید والذبائح ومایؤکل من الحیوان، باب الأمر باحسان الذبح والقتل وتحدید الشفرۃ، رقم الحدیث: ۱۹۵۵

۳۔ سورۃ فصلت: ۳۴

۴۔ النمل: ۱۲۵

ooo